ابنِ خلدون اور اس کا مقدمہ

از

(جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد)

(۳)

پھر ابن خلدون خصوصیت کے ساتھ مسئلہ خلافت پر کلام کرتا ہے اس کی رائے ہے کہ عرب کا کسی کا تابع و فرماں بردار بننا بہت دشوار ہے کیوں کہ ان میں سخت مزاجی، عار، عالی ہمتی اور سرداری کی خواہش پائی جاتی ہے اس لئے ان کی خواہشات کا متفق ہونا مشکل ہے ان میں صرف مذہبی رنگ میں حکومت ہو سکتی ہے کیوں کہ وہ لوگ طبیعتِ سلیمہ رکھنے کی وجہ سے حق اور ہدایت کو سب سے جلد قبول کر لیتے ہیں۔ اور حکومت عرب کے نزدیک اسلام میں، خلافت یا امامت ہے یعنی نیابت صاحبِ شرع محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امورِ دین اور امورِ دنیا دونوں میں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کے استحقاق کی شرطوں میں مسلمانوں میں اختلاف ہوا جس سے تین بڑے نظریئے پیدا ہوئے۔

(۱) اہلِ سنت کی رائے۔ نصبِ خلافت امت پر واجب ہے۔ خلیفہ انتخاب سے منتخب ہوگا، خود خلیفہ کی ذات کو پانچ چیزوں سے متصف ہونا ضروری ہے۔

(۱) امورِ دینیہ کا عالم ہونا۔ تاکہ ان پر عمل کرے اور اپنے اموران سے منطبق کر سکے۔

(۲) عادل ہونا۔ کیوں کہ حکومت میں ایسے مناصب ہوتے ہیں جو عدل کے مقتضی ہیں مثلاً منصبِ قضا۔ اور چوں کہ خلیفہ حکومت کا سردار ہوتا ہے اس لئے عدل کی شرط اس میں ضروری ہے۔

(۳) اس کا خود کافی ہونا اس طرح پر کہ اقامتِ حدود (احکام اور سزاؤں کے نافذ کرنے) پر جری (دلیر) اور لڑائیوں میں گھس جانے پر قادر اور واقف کارِ جنگ ہو...

اور عصبیت کو پہچاننے والا اور سیاسی معاملات اور ذمہ داریوں کو جھیلنے پر قدرت رکھتا ہو۔

(۴) حواس اور اعضاء کے نقص اور بے کار ہونے سے محفوظ ہو جیسے جنون اور اندھا ہونا اور ہاتھ پاؤں کا جاتے رہنا۔

(۵) پانچویں شرط میں اہلِ سنت کا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ کیا خلیفہ قریش میں سے ہونا چاہیئے۔ ابن خلدون کی رائے اس میں اہلِ سنت کے موافق ہے، اس کا خیال ہے کہ جب کہ قریش میں عصبیت ہو تو قریش میں سے خلیفہ مقرر کرنا واجب ہے لیکن اگر عصبیت باقی نہ ہو تو پھر نسب قریشی کچھ قیمت نہیں رکھتا۔

(ب) خوارج اور بعض معتزلہ کی رائے۔ ان لوگوں کی رائے ہے کہ نصبِ خلافت واجب نہیں ہے اس لئے کہ خلافت سے مقصود حدودِ الٰہی قایم کرنا اور احکام نافذ کرنا ہے، جب یہ کام لوگوں کے باہمی اتفاق سے ہو جائے تو خلیفہ کی کوئی حاجت نہیں رہ جاتی۔ ابن خلدون نے اس رائے کو رد نہیں کیا۔

(ج) شیعہ کی رائے۔ فرقہ شیعہ کا یہ اعتقاد ہے کہ امامت واجب ہے، اور وہ بطریقِ وراثت حضرت علی کرم اللہ تعالےٰ وجہہٗ کی اولاد کو حاصل ہوتی ہے۔

پھر ابن خلدون کہتا ہے کہ خود خلافت سلطنت کی جانب منقلب ہو جاتی ہے۔

اُس کے بعد ابن خلدون جبایۃ کا ذکر کرتا ہے "جبایۃ وہ مال ہے جسے گورنمنٹ رعیت سے وصول کرتی ہے"۔ وہ کہتا ہے کہ شروع حکومت میں جبایۃ کے حصے کم ہوتے ہیں مجموعہ زیادہ ہوتا ہے اور آخر حکومت میں اس کے برعکس ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں حکومت بدوی طرز کی ہوتی ہے اس لئے ٹیکس کم لگتا ہے۔ بدوی طرز کی حکومت میں تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ٹیکس مطلقاً نہیں لگتا۔ اس لئے آبادی بڑھ جاتی ہے اور آبادی بڑھنے سے حصوں کا شمار بڑھ جاتا ہے اس لئے جبایۃ کا مجموعہ کثیر ہو جاتا ہے لیکن جب حکومت میں شہریت کا رنگ آجاتا ہے تو وہاں کے باشندوں کی خواہشات میں زیادتی ہو جاتی ہے اس

وقت اموالِ کثیرہ کی حاجت ہوتی ہے اس لئے حکومت کو جبایۃ کی مقدار بڑھانے اور اس کی وصولی میں سختی کرنے کی ضرورت پڑتی ہے لہٰذا عام لوگ تعمیرات اور امنگوں میں سُست پڑ جاتے ہیں اس لئے جبایۃ کا مجموعہ کم ہو جاتا ہے تب ارکینِ حکومت اس امر پر مجبور ہوتے ہیں کہ ٹیکسوں کی مقدار زیادہ بڑھائیں اور طرح طرح کے نئے ٹیکس مقرر کریں اور حکومت کمزور اور اطرافِ بعیدہ سے ٹیکس وصول کرنے سے قاصر ہو جاتی ہے تب قسم قسم کے نئے ٹیکس ایجاد کیے جاتے ہیں جن کو تجارت پر اور ان کی ایک مقدارِ معین بازاروں میں قیمتوں پر اور خود مال تجارۃ پر لگائے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں بازار امیدوں میں خلل پڑ جانے کی وجہ سے سُست پڑ جاتے ہیں اور آبادی کے برباد ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، یہ امر جبایۃ کے عظیم نقصان کا باعث ہوتا ہے تب گورنمنٹ زراعت اور تجارت کی طرف مجبور ہوتی ہے اور یہ چیز رعایا اور جبایۃ کے لئے مضر ہوتی ہے کیوں کہ حکومت رعایا کے راس المال کے اعتبار سے بہت بڑے راس المال کی مالک ہوتی ہے۔ پھر حکومت کبھی تُجّار سے مالِ کثیر لے لیتی ہے غصب کے طریقہ پر یا تھوڑا ثمن دے کر کیوں کہ اس کے خریدنے میں اس سے جھگڑنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ پھر جب زراعت کے فوائد ..... ریشم یا شہد یا شکر وغیرہ کی شکل میں حاصل ہوتے ہیں تو ان لوگوں کو جو ان چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں ان سامانوں کے خریدنے کی تکلیف دیتی ہے اور اس کے ثمن کو قیمت کے مساوی یا اس سے زیادہ ٹھہراتی ہے ..... اور کبھی حالت کی انتہا ہی ہو جاتی ہے کہ سرکاری لوگ غلّوں اور سامان کو ان کے مالکوں سے جو کہ ان کے شہر میں پہنچتے ہیں خریدنے پر آمادہ ہوتے ہیں اور ثمن جتنا چاہتے ہیں مقرر کرتے ہیں اور ان سامانوں کو ان کی ضرورت کے وقت میں رعایا کے ہاتھ اس ثمن سے جو وہ خود مقرر کرتے ہیں بیچ ڈالتے ہیں۔ اور یہ حالت پہلی حالت سے زیادہ سخت، رعیت کو زیادہ تباہ کرنے والی اور ان کے احوال کو زیادہ خراب کرنے والی ہے۔

۵۔ وہ احوال جو اجتماعِ حضری میں پیش آتے ہیں: خصوصاً شہروں اور بڑی عمارتوں میں ۔ بے شک بادشاہ شہر میں قیام کی خواہش کرتا ہے آرام و سکون حاصل کرنے

کے لئے اور آسائش کو دوست رکھنے کی وجہ سے۔ پھر کبھی باہمی تعاون کی حاجت اور کارکنوں کی کثرت اس کی مقتضی ہوتی ہے کہ منتظمینِ امورِ سلطنت لوگوں کو شہروں میں بسنے پر آمادہ کریں تاکہ ان شہروں سے وہ قلعوں کا کام لیں جب کہ کوئی ان سے جھگڑا کرے یا کوئی ان پر اچانک جا پہنچے۔" شہر پر غلبہ حاصل کرنا نہایت دشوار ہے، شہر متعدد لشکروں کا قائم مقام ہوتا ہے کیوں کہ اس میں حفاظت کا اور دیواروں کے پیچھے سے جنگ کا موقع ہوتا ہے بغیر اس کے کہ زیادہ فوج کی یا زیادہ اسلحہ کی ضرورت پڑے۔" پھر بڑے شہروں کو منتظمانِ سلطنت بہت سے کاریگروں کو جمع کر کے بناتے ہیں اور انجنیروں اور انجنیری کے آلات سے مدد لیتے ہیں۔ نیز ضروری ہے کہ شہروں کے وضع میں کشادہ اطراف اور زرعی اور تجارتی اور فوجی میدانوں کا لحاظ رکھا جائے اہلِ شہر کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی شہر اسی قدر بڑھیا ہوگا۔

شہروں میں بسنا اس کا مقتضی ہوتا ہے کہ مکانات بنائے جائیں اور باغات لگائے جائیں لیکن عمارتیں زیادہ مفید نہیں ہوتیں۔ اور جب حکومت کمزور ہو جاتی ہے اور شہر پر دشمن کے حملہ کا خوف ہوتا ہے تو عمارتیں اور زمینیں بالکل سستی ہو جاتی ہیں۔ جائداد کے مالک شہر میں جاہ اور عصبیت کے حاجت مند ہوتے ہیں کہ اپنی جائدادوں سے دوسروں کے جبر اور زیادتی کو دفع کریں اور بادشاہ کے لالچ کو اس سے ہٹائے رہیں کہ وہ سخت ٹیکس اس پر نہ لگائے۔ نیز شہر صنعتوں سے ممتاز ہیں۔ تقریباً ہر شہر ایک خاص صنعت کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ پھر آسائش اور عادات کی زیادتی بدوی کو شہروں میں قیام کرنے سے مانع ہیں کیوں کہ بدوی ان اخراجات سے جو بڑی شہریت کے لئے لازم ہیں عاجز ہے۔ پھر کسی شہر پر جتنا زمانہ زیادہ گزرتا ہے اس کی حضارت وسیع ہوتی جاتی ہے اور وہ حکومت جس نے اسے آباد کیا ہے حکومت اور غلبہ میں زیادہ پائدار ہو جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ حکومت ختم ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ شہر بھی ختم ہو جاتا ہے جس کو اس حکومت نے اپنے لئے بنایا تھا یا جو اس حکومت کی وجہ سے بنا تھا، ابن خلدون شہروں کی ویرانی کی علت یہ بتاتا ہے کہ ان کے لئے ایک عمر مقرر ہوتی ہے، شہروں

کی ویرانی کی علامات میں سے شہروں میں حضارت کی زیادتی اور حاجاتِ کمالیہ کی زیادتی کی ہے جو عادت کے ساتھ ضروریہ بن جاتی ہیں ان کے باشندے اخراجات میں اسراف کے مرتکب ہوتے ہیں حتیٰ کہ اپنی ضروری حاجات سے عاجز ہوجاتے ہیں گرانی پیدا ہوجاتی ہے اور بازار خراب ہوجاتے ہیں تو ٹیکس میں کمی آجاتی ہے اس کے ساتھ ہی یہ ہے کہ شہری زندگی نسل، خلق اور بدن کے لئے مُضر ہے۔

ابن خلدون کی عجیب ترین اور صحیح ترین رایوں میں سے اس کا یہ قول ہے کہ شہر کے باشندے جب بہت بڑھ جاتے ہیں تو ضروری غذا کا نرخ ارزاں ہوجاتا ہے اور کمائی کا نرخ گراں ہوجاتا ہے اور اگر باشندے کم ہوتے ہیں تو اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آبادی جب عظیم ہوجاتی ہے تو امورِ کمالیہ کی طلب کثیر ہوجاتی ہے اور موجود اسٹاک حاجت کے لئے ناکافی ہوتا ہے تو راحت و آسائش والے بڑی قیمت ادا کر کے لیتے ہیں اس لئے وہ گراں ہوجاتا ہے اسی طرح کام کرنے والوں کی اُجرت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ بھی ہے کہ شہروں میں نرخ بادیہ کے نرخ کے اعتبار سے گراں ہوتا ہے۔ کیوں کہ شہروں میں بالخصوص حکومت کے آخر میں طرح طرح کے محصول اور ٹیکس کی زیادتی ہوجاتی ہے۔

۶۔ حضر میں کسب اور معاش کے طریقے۔ ابن خلدون کے نزدیک کَسَبْ کی بُنیاد انسانی عمل ہے کیوں کہ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ فائدے اور کمائیاں سب کے سب یا ان میں سے زیادہ تر انسانی اعمال کے معاوضے ہیں اور معاش کی صورتیں بہت ہیں مثلاً

(۱) دوسرے کے ہاتھ سے مال لے لینا رواجی قانون پر اقتدار کی وجہ سے۔ اس کا نام جرمانہ یا ٹیکس رکھا جاتا ہے۔

(۲) صحرائی جانور کو کسی ہتھیار سے چیر پھاڑ کر یا اس کو کسی تدبیر سے خشکی یا تری سے پکڑنا۔ اس کا نام شکار رکھا جاتا ہے۔

(۳) پالتو جانور سے اس کی وہ زائد چیزیں جن میں لوگ تصرف کر کے نفع پاتے ہیں الگ کرنا

جیسے دودھ - اون - ریشم اور شہد -

(۴) نباتات سے نفع کمانا -

(۵) انسانی اعمال سے روزی کمانا وہ صناعۃ ہو یا زراعت ہو یا خدمت ہو - خدمت کا یہ مفہوم ہے کہ ایسے کاموں کو جن کا خود کرنا ضرورت مندوں کو شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے دوسروں سے معاوضہ دے کر کرانا - ایسے کاموں کو اُجرت پر انجام دینا خدمت ہے (یہ حالت (خدمت) انسان کی طبعی جواں مردی کے اعتبار سے ناپسند چیز ہے اس لئے کہ دوسروں پر بھروسا کرنا عجز ہے . . . . اور خدمت عجز اور نامردی پر دلالت کرتی ہے اور جواں مردی کے طریقوں میں ان دونوں (عجز و خنث) سے مُنزہ ہونا ضروری ہے) مگر یہ تو آرام طلبی اور آسودگی کا نتیجہ ہے - اسی طرح موہوم دفینوں سے اموال حاصل کرنے کی کوشش کرنی غیر طبیعی امر ہے اور ظاہر یہ ہے کہ جاہ سے مالی فائدہ ہوتا ہے کیوں کہ لوگوں کی عادۃ ہے کہ جاہ والے سے تقرب چاہتے ہیں، اس پر اعتبار کرتے ہیں اور اس سے معاملات کرتے ہیں (خواہ وہ جاہ دینی ہو یا اجتماعی ہو یا تجارتی ہو) اور اس میں شک نہیں کہ بہت کچھ کمائی انھیں کو حاصل ہوتی ہے جو دبّو اور خوشامدی ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ہم ان لوگوں میں جو عالی ہمّت اور بلند حوصلہ ہوتے ہیں زیادہ لوگوں کو پاتے ہیں کہ ان کو جاہ کا مقصد نہیں حاصل ہوتا پس وہ اپنی محنتوں سے کمائی پر قناعت کرتے ہیں اور فقر و فاقہ برداشت کرتے ہیں . . . . پھر کاموں کا معاوضہ ضرورت و حاجت کے اعتبار سے متفاوت ہوتا ہے - اگر وہ اعمال آبادی میں ضروری اور عام طور پر کارآمد ہیں تو ان کا معاوضہ بہت زیادہ ہوگا اور ان کی طرف حاجت شدید ہوگی - اور اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ دین کے کاموں مثلاً قضا، فتویٰ نویسی، علوم دین کا پڑھانا اور امامت اور وعظ اور اذان کو انجام دیتے ہیں عموماً وہ زیادہ مال دار نہیں ہوتے -

ابن خلدون پانچ قسم کی کمائیوں کو انسان کے لئے طبیعی بتاتا ہے -

(۱) فلاحۃ (کاشتکاری) یہ سب صنعتوں پر مقدم ہے کیوں کہ اس سے غذا حاصل ہوتی

ہے جس سے حیاتِ انسانی کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور اس پیشہ کو دیہاتیوں سے خصوصیت حاصل ہے کیوں کہ گاؤں شہر سے پہلے ہے۔ اور کاشتکاری منکسر المزاج اور امن پسند دیہاتیوں کا ذریعہ گذران ہے۔ اور اسی لئے غالباً کوئی شہری یا کوئی راحت پسند آدمی اس پیشہ کو اختیار نہیں کرتا۔

(ب) **تجارۃ** ۔ وہ کمائی چاہنا ہے مال کو اس طرح بڑھا کر کہ کوئی سودا کم دام میں خرید کر زیادہ دام میں بیچا جائے۔ اس معاملہ سے جو زیادہ مال ملتا ہے اس کو 'نفع' کہتے ہیں۔ اس نفع کا خواہش مند یا تو سامان کو اکٹھا رکھتا ہے اور جب بازار میں اس سامان کا نرخ گراں ہو جاتا ہے تب بیچتا ہے تو اس کو عظیم نفع ملتا ہے۔ یا اس سامان کو ایسے مقام میں بھیجتا ہے جہاں اس کا خرچ اور مانگ زیادہ ہے وہاں وہ سامان زیادہ قیمت پر جاتا ہے تو زیادہ نفع ملتا ہے۔ اور چوں کہ نفع راس المال کے اعتبار سے کم ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ راس المال بڑا ہو تاکہ اس سے بڑا نفع حاصل ہو۔ پھر کبھی راس المال اور نفع دونوں میں سے بہت کچھ کھوٹا ہونے اور کم تولنے اور ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے کی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے اور کبھی دَین کے انکار کی وجہ سے تاجر کا کل مال ضائع ہو جاتا ہے ہاں اگر تاجر جھگڑے پر دلیر حساب سے واقف مقدمہ باز حکام رس ہو تو اس ضرر سے بچ سکتا ہے ورنہ اس کو خریدار لقمہ بنالے گا کیوں کہ عموماً لوگوں میں اور خصوصاً ظالموں اور خریداروں میں یہ بات بہت پائی جاتی ہے کہ وہ لوگ دوسروں کے مال کے حریص اور اس کے لوٹنے والے ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے تاجروں کے اخلاق سرداروں اور بادشاہوں اور رئیسوں کے اخلاق سے گرے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ بے مروت ہوتے ہیں کیوں کہ ان کو جھگڑا اور مقدمہ بازی اور کھوٹ کرنے اور دام بتانے میں جھوٹی قسموں کی عادت ہو جاتی ہے گو بہت کم تاجر ان باتوں سے بچتے بھی ہیں۔ اور گو وہ لوگ ظاہر بھی کرتے ہیں کہ وہ ان بُری باتوں کے مرتکب صرف کمانے کے لئے ہوتے ہیں۔ مگر کچھ دنوں میں یہ چیزیں ان کی پختہ عادت بن جاتی ہیں۔ اور ابن خلدون کی رائے ہے کہ نرخوں کی ارزانی تاجروں کو اور خود آبادی کو بھی ضرر رساں اسی طرح ہے جس طرح سخت گرانی ہے کیوں کہ جب نرخ بہت ارزاں ہو جاتا ہے۔

تو تاجروں کا حال خراب ہو جاتا ہے اور وہ ارزاں قسم کی خرید و فروخت سے اور اُس کے پیدا کرنے سے رک جاتے ہیں۔ ہاں زراعت میں ارزانی پسندیدہ ہے کیوں کہ اس کی طرف عام حاجت ہوتی ہے اور غذاؤں کی طرف لوگ بے چین رہتے ہیں۔

(ج) صناعۃ۔ صناعت اس ملکہ کو کہتے ہیں جو کسی ایسے امر میں ہوتا ہے جو عملی بھی ہے اور فکری بھی۔ وہ عمل کے لئے جسمانی مشقت کا مقتضی ہے اور صنعت کے لئے تعلیم عقلی کا اور اس کے سیکھنے میں کچھ زمانہ کی حاجت ہوتی ہے صناعت کے آسان اور مشکل ہونے کے اعتبار سے۔ ترقی پذیر صنائع شہر کے لوازم میں سے ہیں۔ اور صنائع کی ترقی آبادی کی وسعت اور قدامت اور استحکام کے تابع ہے۔ ابن خلدون کا اعتقاد ہے کہ جو شخص کسی ایک صناعت میں کامل ہوتا ہے اس کا دوسری صناعت میں ماہر ہونا کم ہوتا ہے۔ پھر صنائع میں ترقی اور کثرت اس وقت ہوتی ہے جب کہ اس کی مانگ بہت ہو کیوں کہ اس وقت وہ سامانِ تجارت کے مانند ہو جاتے ہیں۔ ابن خلدون اس کا بھی مدعی ہے کہ عرب (بدو) صنائع سے سب آدمیوں سے زیادہ دور ہیں۔ اور بڑے صنائع میں سے کاشتکاری اور تعمیر اور بڑھئی کا کام اور کپڑا بننا اور سلائی کا کام عملی ہے۔ اور نافع آزاد پیشوں میں سے فنِ تولید اور طب ہے لیکن کہاں؟ بستیوں اور شہروں میں۔ صحراؤں میں نہیں۔ کیوں کہ بیماری راحت و آسائش کا نتیجہ ہے اور وہ صحرا میں معدوم ہے۔ ، عمدہ انسانی صنائع میں سے خوشنویسی اور کتابوں کو لکھنا اور جلد سازی اور موسیقی ہے، ابن خلدون کا صنائع پر ایک عمدہ نہایت محکم نظریہ ہے وہ یہ کہ صناعت سے صانع کو عقل حاصل ہوتی ہے کیوں کہ صنائع میں مشغول ہونے اور ان کے درجات کو بتدریج طے کرنے اور اس کی باریکیوں کی مشاقی سے عقل میں پختگی پیدا ہوتی ہے اس لئے کہ صنائع کے لئے کچھ قاعدے ہوتے ہیں کہ جب آدمی انھیں جان لیتا ہے تو اس کی نفس اور عقل میں کچھ علوم مرتب ہو جاتے ہیں پس ان سے عقل زیادہ ہو جاتی ہے۔

۷۔ انسانی آبادی میں علم و تعلیم طبیعی امر ہے۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ہم اس فصل کو مفصل

طور پر بیان کریں کیوں کہ یہ علوم کے کل انواع کو مشتمل ہے لیکن میں ابن خلدون کے آراء خاصہ کو علوم مختلفہ میں بیان کرتا ہوں پھر اس کی رائیں تعلیم کے بارے میں بیان کروں گا کیوں کہ وہ رائیں نہایت صحیح اور جدید ہیں۔

ابن خلدون کی رائے ہے کہ انسان دوسرے حیوانات سے متمیز ہے اس فکر کی وجہ سے جس سے اس کو اپنے معاش کے حاصل کرنے کی اور اپنے ہم جنسوں سے تعاون کی اور انبیاء کی تعلیم کو قبول کرنے کی راہ ملتی ہے اور وہ ہمیشہ فکرمند رہتا ہے فکر سے کبھی سُست نہیں پڑتا اور حضارت کی ترقی کے ساتھ علوم کی کثرت ہوتی ہے کیوں کہ وہ بھی صنائع کمالیہ میں سے ہیں۔ پھر علوم کی دو قسم ہیں۔

۱۔ وہ جو کہ انسان کے لئے طبیعی ہیں جن کو انسان اپنے غور و فکر سے پالیتا ہے جیسے علوم فلسفیہ

(۲) وہ جو واضع شرعی سے بذریعہ خبر کے حاصل ہوتے ہیں اور ان میں عقل کو کچھ دخل نہیں ہے مگر مسائلِ فرعیہ کو اصول کے ساتھ لاحق کرنے میں۔ اور وہ علوم نقلیہ وضعیہ ہیں اور وہ شرعی علوم کتاب و سنت ہیں جو ہمارے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مشروع ہیں اور وہ علوم ہیں جو ان سے متعلق ہیں پھر ان کے لئے زبان عربی کے علوم ضروری ہیں۔

(۱) علوم نقلیہ قرآن کے علوم ہیں یعنی قراءات و تفسیر۔ پھر حدیث و فقہ اور فرائض (میراث) کے علوم۔ اور علمِ کلام اور اس علم کا مقصد ان لوگوں کا رد کرنا ہے جو سلف کے مذاہب سے اعتقادات میں منحرف ہیں۔ ابن خلدون کی رائے ہے کہ اس علم (کلام) کی طرف اس زمانہ میں حاجت تھی جب کہ مبتدعین کی کثرت تھی مگر اب (ابن خلدون کے زمانہ میں) اہلِ بدعت کا وجود باقی نہیں ہے اس لئے اب اس علم سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسی طرح علم تصوف ابن خلدون کے نزدیک علوم شرعیہ حادثہ فی الملۃ سے ہے اور اس کی بنا دنیا سے بے رغبتی پر ہے لیکن متاخرین متصوفین راہ مستقیم سے بہک گئے ہیں۔ اور ابن خلدون کا اعتقاد ہے کہ بعض اولیاء کے لئے ایسی کرامات ہیں جن سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور وہ ظاہر کرتا ہے کہ صوفیہ میں سے جو لوگ معتدل ہیں ان کی رائیں قبول کرنا چاہیئے اور اس کا اعتقاد ہے کہ خواب کا وجود ہے اور اس کی تعبیر ضروری ہے کیونکہ

وہ معلوم ہے معلوماتِ غیب میں سے۔ اس لئے کہ وہ (سچا خواب) نبوت کا ایک چھوٹا جزو ہے۔

(ب) ابن خلدون علومِ عقلیہ کو ذکر کرتا ہے اور ان کا حال بیان کرتا ہے اور علوم عددیہ مثلاً حساب اور جبر و مقابلہ اور معاملات (تجارتی حساب) کے بارے میں کچھ رائے ظاہر نہیں کرتا پھر علومِ ہندسیہ کی طرف جھکتا ہے تو ہندسہ مسطحہ اور ہندسہ مخصوصہ باشکال کرویہ اور مخروطات پھر مساحت پھر مناظر (بصریات) کو ذکر کرتا ہے اور عقل میں ان سب کے مؤثر ہونے کی مدح کرتا ہے اور علم ہیئت (فلک) پر کلام کرتا ہے۔ اور بعد ازیں وہ منطق اور طبعیات کو ذکر کرتا ہے اور طب کو اس بنا پر کہ وہ طبعیات کی ایک فرع ہے علم کی طرح نہ صناعت کی طرح۔ اور اسی طرح فلاحت ہے۔ پھر علم الٰہیات پر کلام کرتا ہے اور اس کی تاریخ بخوبی بیان کرتا ہے اور اپنا میلان نہیں ظاہر کرتا۔ اور جب وہ سحر اور طلسمات پر کلام کرتا ہے تو تاثیر روحانی کا انکار نہیں کرتا اور وہ وجود سحر کا منکر نہیں ہے جیسا کہ دینی روایات میں آیا ہے لیکن اس کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ ضرر رساں ہے اور عقیدہ ایمانیہ کو خراب کرنے والا ہے کیوں کہ وہ امور کو غیر اللہ کی طرف راجع کرتا ہے اور وہ سحر کی ترغیب نہیں دیتا بلکہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ اور کیمیا (کم قیمت دھات مثلاً سیسہ۔ تانبا کا قیمتی دھات مثلاً چاندی۔ سونا بن جانا) پر کلام کرتا ہے تو کیمیا گروں کے اقوال پیش کرنے کے بعد اس کا انکار کرتا ہے اور اس کے محال ہونے کا یقین کرتا ہے۔ اس کے بعد کہ وہ فلسفہ کے نتیجہ کا اس قول سے انکار کر چکا ہے "کہ وہ موجودات جو حس کے دائرہ سے باہر ہیں اور وہ روحانیات ہیں سو ان کی ذاتیں بالکل غیر معلوم ہیں اور نہ ان تک پہنچنا ممکن ہے اور نہ ان پر دلیل قایم کرنا" ابن خلدون اس فن نجوم کے بطلان کا قائل ہے جس کا مقصد ستاروں کے ذریعہ سے غیب کا جاننا ہے۔ اس لئے کہ کواکب کی تاثیر اس کے نیچے والی چیزوں میں باطل ہے کیوں کہ توحید کے باب میں ثابت ہو چکا ہے کہ سوا اللہ کے کوئی موثر (بالذات) نہیں ہے۔

(ح) خاص صناعت تعلیم۔ تعلیم ایک خاص صناعۃ ہے اس کی غرض علم کی استعداد

سیکھنے والوں کے نفوس میں پیدا کرنا ہے یہ نہیں کہ طالب علموں کو علوم کے مسائل فرعیہ کے حفظ کرنے پر اُبھارا جائے ۔ ابن خلدون اس نظریہ کی تحقیق کے لئے چند قاعدے مقرر کرتا ہے

(۱) طالب علم کی عقلی قوت کی رعایت کرنا کسی نوع کے علم سکھانے میں ۔ اور اس نوعِ علم کی مقدار کی رعایت ۔

(۲) طالب علم کو آسان سے آسان طریقہ پر تین بار تعلیم دینا (جان لو کہ طالب علم کو علم سکھانا اس وقت مفید ہوتا ہے جبکہ بتدریج ایک ایک چیز کی تھوڑی تھوڑی تعلیم دی جائے پہلے اس کو فن کے ہر باب کے وہ مسائل بتائے جائیں جو اس باب کے اصول ہیں اور ان مسائل کی شرح اجمالی طور پر بتائی جائے لیکن اس میں اُس کی عقل کی قوت اور استعداد پر قبول کرنے کے لئے سکھائی جانے والی باتوں کے نظر رکھی جائے یہ صورت فن کے آخر تک جاری رہے اس طریقہ سے طالب علم کو اس علم میں ملکہ حاصل ہو جائے گا لیکن یہ ملکہ ناقص اور کمزور ہوگا اس ملکہ کا فائدہ یہ ہے کہ وہ طالب علم کو اس فن کے سمجھنے اور اس کے مسائل حاصل کرنے کے قابل بنا دے گا ۔ اس کے بعد اسے دوبارہ اس فن کی طرف متوجہ کیا جائے اس دفعہ اُس کو پہلے سے بڑے پیمانہ پر تعلیم دی جائے اور شرح اور تقریر پورے طور پر کی جائے اجمال سے نکال کر تفصیل کی طرف لایا جائے اختلاف اور اس کی وجہ بیان کی جائے اسی طرح پورے فن کی تعلیم ہو اس سے اس کا ملکہ پختہ ہو جائے گا ۔ اب قوی ہونے پر اس کو سہ بارہ فن میں لگایا جائے ہر مشکل اور مبہم اور دشوار مسئلہ اس پر واضح کیا جائے اور ہر بات اس پر کھول دی جائے اب وہ فن سے بخوبی واقف ہو جائے گا اور اس کا ملکہ کامل ہو جائے گا ۔ یہ تعلیم کا مفید طریقہ ہے ۔ عموماً یہ تین بار میں حاصل ہوتا ہے جیسا کہ ابھی جان چکے ہو ۔ کبھی تین بار سے کم میں بھی بعض کو یہ بات حاصل ہو جاتی ہے یہ متعلم کی حالت پر مبنی ہے ۔

(۳) بہتر یہ ہے کہ متعلم ایک ایک علم میں مشغول ہو بغیر ایک علم کے پختہ کئے ہوئے دوسرے علم میں نہ لگے ۔ "تعلیم میں عمدہ طریقوں میں سے یہ ہے کہ طالب علم کو اکٹھا دو علموں میں نہ بھڑا دے

کیوں کہ اس صورت میں بہت کم کامیابی ہوتی ہے کہ طبیعت دو طرف بٹ جاتی ہے اور ہر علم سے ہٹ کر دوسرے علم کے سمجھنے کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے اس لئے دونوں علم اس کے لئے مشکل ہو جاتے ہیں اور دونوں میں ناکام ہو جاتا ہے اور جب ایک علم میں فکر کو مشغول کر دیتا ہے اور صرف اسی میں لگا رہتا ہے تو عموماً تحصیلِ علم میں یہ طریقہ بہتر ہوتا ہے۔

(۴) "معلم کو چاہیئے کہ ایک فن کی تعلیم میں مجالس کی تفریق کو طویل نہ کرے اور مجالسِ تعلیم کے درمیان میں ناغہ نہ بڑھائے کیوں کہ اس سے بھول جانے کا اور فن کے بعض مسائل کا بعض سے الگ ہو جانے کا خطرہ ہے اس لئے تفریقِ مجالس سے حصول ملکہ دشوار ہو جائے گا اور جب علم کی باتیں شروع اور آخر کی غور و فکر کے سامنے حاضر رہیں گی اور نسیان نہ پیش آئے گا تو ملکہ کا حاصل ہونا آسان ہوگا اور مسائل میں ارتباط قوی ہوگا اور ذہن میں جلد مرتسم ہوں گے کیوں کہ ملکہ فکر کے لیے دریے اور بار بار پائے جانے سے ہوتا ہے اور جب فعل میں تاخیر ہوگی تو ملکہ فعل ہی سے ناشی ہوتا ہے اس لئے اس کے حاصل حصول میں بھی تاخیر ہوگی۔

(۵) طالب علموں پر سختی کرنا ان کو مضر ہے (خصوصاً چھوٹے بچوں پر کیوں کہ اس سے ملکہ بگڑ جاتا ہے جس طالب علم کی تربیت میں جور و قہر سے کام لیا جاتا ہے قہر اس پر غالب ہو جاتا ہے اور اس کا امنگ و انبساط رخصت ہو جاتا ہے اس میں تنگدلی اور سستی اور کم ہمتی آجاتی ہے جھوٹ اور فریب پر وہ آمادہ ہو جاتا ہے یعنی مافی الضمیر کے خلاف ظاہر کرتا ہے اس خوف سے کہ قہر کے ڈنڈے اس پر پڑیں گے" اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ انسانیت سے الگ ہو جاتا ہے اور دوسروں پر بار ہو جاتا ہے اور فضائل اور خلق جمیل کے حاصل کرنے سے نفس سست ہو جاتا ہے

(۶) "علوم کے طلب میں اور اساتذہ سے ملاقات کے لئے سفر کرنا تعلیم میں کمال کو زیادہ کرنے والا ہے" اور اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ معلومات اور اخلاق کو اور ان مذاہب و فضائل کو جنہیں اختیار کرتے ہیں کبھی علم و تعلیم سے حاصل کرتے ہیں اور کبھی اساتذہ سے مل کر اور ان سے سن کر حاصل کرتے ہیں مگر ملکات کا حصول اساتذہ سے مل کر اور ان سے سیکھ کر بہت مستحکم اور راسخ ہوتا ہے خصوصاً جب کہ اساتذہ متعدد ہوں اور ان کی تعلیم میں تنوع ہو۔ (باقی آئندہ)